ڈاکٹر شبانہ امان اللہ
پرنسپل
گورنمنٹ گریجویٹ کالج فار ویمن
راولپنڈی

منشا یاد کا افسانوی اُسلوب۔ایک جائزہ

Abstract:

Urdu fiction has taken multiple turns during its vast and eclectic history. From progressive to spiritual and from western to linguistic detailings, Urdu fiction has demonstrated its versatility in every era. Mansha Yaad was a prolific fiction writer of the late twentieth century who, through his detailed and imaginative writings painted a vivid portrait of our society. Yaad's writing style, his characters and his plots showed him not only as a champion of the downtrodden masses but he also left an unequivocal mark on contemporary Urdu literature. Influences of rural, political, religious, social and economic history is clear in his stories which makes him relevant and celebrated to this very day. His usage of symbolic, metaphorical and stream of consciousness techniques, his literary sensibilities, humane artistry and hyper awareness of rural issue enables him to transcends the prison of time and place and makes him universal to all generations.

Key Word: Urdu fiction, Progressive, demonstrated, contemporary

اُردو افسانہ نگاری کی روایت نے کئی کروٹیں بدلیں؛ کئی نشیب و فراز عبور کیے؛ گزرتے وقت کے ساتھ اُمڈتے نظریات سے اثر پزیری حاصل کی اور پھر ایک سیلِ رواں کی طرح یہ سفر آج تک جاری و ساری ہے۔

میں اس سفر کے دوران میں کبھی ترقی پسندانہ نظریات نے چشم تماشا کو کئی منظر دکھائے، کبھی روحانیت کی گود میں شعور انسانی کو لوریاں سنائی گئیں، کہیں حلقہ ارباب ذوق کے مصنفینے اپنا اپنا اندازِ فکر افسانے کے روپ میں ڈھال کہ قاری کے سامنے رکھا۔ مغربی نظریات بھی دل و دماغ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر

گہرے اثرات مرتب کرتے گئے۔ وجودیت، تاثریت، تجریدیت علامت نگاری، جدیدیت، لسانی تشکیلات جیسی تحریکیں بھی افسانہ نگاری پر گہرے نقوش چھوڑ گئیں۔

اس تمام سفر میں اگر ہم منشایاد کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیں تو انھوں نے ۱۹۵۰ کی دہائی کے آخر میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ''بند مٹھی میں جگنو'' سے لے کر ''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' تک منشایاد نہ صرف ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ گذشتہ چھ دہائیوں سے معاشرتی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے عکاس بھی ہیں۔ اُن کی کتاب منشایئے، بھی اپنے طرز کی منفرد تحریر کی عکاسی کرتی ہے۔

انہوں نے اپنے نوکِ قلم سے معاشرے میں موجود مسائل کو چھوا، محسوس کیا، خود پر طاری کیا اور افسانے کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ اُن کے افسانے صرف تفننِ طبع یا لذت آفرینی کے لیے نہیں ہیں بل کہ وہ ایک ماہر مصور کی طرح لمحہ بہ لحہ بدلتے سماج، بھوک افلاس اور نفسیاتی عارضوں میں مبتلا انسانی رویوں کو افسانے کے کینوس پر پینٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ معاشرتی جبر اور ناانصافی، معاشی استحصال، شعور اور ذہن میں جنم لینے والے سوچ اور تشکر کے جال کو منشایاد جب لفظوں کی زبان میں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں تو ان کے افسانے گذشتہ ساٹھ سالوں کی تاریخ پیش کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔

منشایاد کو فطرت نے کہانی نویس بنایا۔

ذوقِ بزم آرائی اور ذوق داستان سرائی اُن کو اپنے گھر کے ماحول سے عطا ہوا۔ طبیعت کی حساسیت نے انہیں عام سطح سے ہٹ کر چیزوں کو دیکھنے، محسوس کرنے اور اُن کے باطن میں اتر کر عمیق مشاہدے کی صلاحیت عطا کی۔ شاعرانہ مزاج رکھنے والا یہ فنکار افسانہ تخلیق کرنے کے لیے اپنے اندر کے شاعر کو تیاگ دیتا ہے۔ اور اپنے دل و دماغ میں پرورش پانے والے کرداروں کی وسیع دنیا کو ظاہر کے آئینے میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے اور اس میں کامیاب بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں موضوعات، اسالیب اور فکر کا تنوّع موجود ہے۔

منشایاد نے بہت سے سینئر افسانہ نگاروں سے اثر قبول کیا لیکن شعوری طور پر ان میں سے کسی کی تقلید نہیں کی نہ ہی کسی سینئر افسانہ نگار کے فکر و اسلوب کا سحر اُن کو گرفتار کر سکا۔ منشایاد نے اپنے انداز اور اظہار کی راہیں خود متعین کیں۔ منشایاد کی افسانہ نگاری دیہی اور شہری زندگی کی زندہ تصاویر اور اُن سے تراشیدہ حقیقی کرداروں کو فن کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں نچلے طبقے کے لوگوں کو جو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، جو محض جبلتوں کے سہارے جیتے ہیں، جو ازل سے بھوک مٹانے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں، قوت

گویائی عطا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو گاؤں کی زندگی کی جھلکیاں اپنی جزئیات کے ساتھ ملتی ہیں اور دوسری طرف شہری ہما ہمی، بیورو کریسی کی اجارہ داری، سیاست کی سجتی اُلٹتی بساط اور خوف و دہشت کے زیر اثر سہمی ہوئی انسانی نفسیات کا بھرپور تجربہ پیش کرتے ہیں۔

منشایاد مصلح نہیں۔ نہ ہی وہ مصلح بننا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے انھیں مسیحا قرار دیا ہے۔ کیوں کہ وہ اظہار کے کئی قرینے پیش کرتے ہیں۔ وہ مختلف کرداروں کے باطن میں اتر کر ان کی کیفیات کو خود پر طاری کر کے حتیٰ کہ حیوانات کی کھال اور نباتات کی جڑوں میں گھس کر اُن کے اصل جوہر کی جستجو کرتے ہیں۔ وہ دنیا کو ایک اکائی تصور کرتے ہیں۔ تجریدیت، علامت نگاری کے دور میں بھی اعتدال کو اپنے فن کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ اُن کا افسانے کا تصور بہت واضح ہے۔

بقول منشایادؔ:

> ''میرے نزدیک افسانہ ایک ایسا مختصر نثر پارہ ہے جس میں کسی واقعہ منظر، خیال جذبہ، تجربہ، احساس، کردار یا روحانی کیفیت کو ایسے بہترین اور موثر انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے والے کو متاثر کرنے اور اُس کی یاداشت کا حصہ بن جائے اور اُسے زندگی کے معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شعور بخشے۔''(۱)

منشایاد کے بیشتر افسانے اس تصورِ تخلیق کے غماز ہیں۔ جو اُن کی ژرف نگاہی اور گہری حساسیت سے نمود پا کر موضوعات اور فکر و فن کے تنوع کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کی سوچ استدلالی ہے۔ وہ ترقی پسندانہ نظریات کے قائل ہیں۔ جمود، ٹھہراؤ اور حد درجہ روایت پسندی سے صرفِ نظر کر کے ہر دور میں وقوع پزیر ہونے والی تبدیلیوں کو افسانے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مکتبہ فکر سے منتھی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ جب بھی کوئی فنکار خود کو کسی خاص نقطہ نظر کے تابع کر دیتا ہے۔ تو وہ اپنے ارد گرد کی دنیا کو اسی کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس کا اپنا آزاد اندازِ فکر اس مکتبہ فکر کی قید میں رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منشایاد خود کو، اپنی آزادی فکر کو کسی بھی مخصوص نظریے کا اسیر نہیں کرنا چاہتے۔ اس لیے وہ کما حقہ سعی کرتے ہیں کہ اپنا نقطہ نظر افسانوں کی آبیاری کے لیے استعمال کریں۔

جہاں تک اُن کا پلاٹ سے افسانہ نگاری تک کے سفر کا تعلق ہے وہ سب سے پہلے خیال کی پنیری لگاتے ہیں۔ اگر اس میں نمود کی گنجائش ہو تو پھر پلاٹ کی تشکیل کرتے ہیں۔ کرداروں کی تخلیق کرتے ہوئے اُن سے

مخاطب ہو کر اُن کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں پھر اس سارے عمل کو ذہن کی بھٹی کے سپرد کر کے بالآخر ایک افسانے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی افسانہ نگاری کے عمل کو انڈے سینے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر وہ پتھریلے نہ ہوں تو کچھ عرصہ بعد انڈوں سے خول توڑ کر بچے باہر نظر آتے ہیں اور ذہن چوں چوں کی آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ کہانی تخلیق کرنے کی صلاحیت اُن کو وہبی طور پر عطا کی گئی۔ اُن کے اندر کی کہانیاں اُن کو انہیں باہر کی دنیا میں پیش کرنے پر اکساتی رہتی ہیں۔ اس لیے منشایاد ایک حقیقی فنکار ہیں۔

منشایادؔ نے ابتدائی کہانیاں روایتی اور وضاحتی اسلوب کے تحت لکھیں مگر عصری تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ علامتی تجریدی اور نیم علامتی کہانیاں لکھنے کے باوجود کہانی پن سے پہلو تہی نہیں کی۔ چونکہ وہ ترقی پسندانہ فکر کے حامل ہیں لہذا وہ جدیدیت کی تحریک کو ترقی پسند افسانے کے لیے حیاتِ نو قرار دیتے ہیں۔ وہ اُن افسانہ نگاروں کی صف میں نہیں کھڑے ہوتے جو لسانی تشکیلات کی آڑ میں بے ڈھب اور مہمل جملے بازی کو جدیدیت قرار دیتے ہیں اور افسانوں کے اہم حصوں، کردار، پلاٹ اور کہانی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جس افسانے میں یہ اجزا نہیں ہونگے وہ افسانہ روکھا پھیکا ہو گا۔ ستر کی دہائی افسانہ نگاری میں ایک معتدل اور متوازن رجحان رواج پایا تو منشایادؔ نے اس کی پزیرائی کی اور نئے تجربوں کو افسانہ نگاری کے لیے تازہ خون قرار دیا۔ چونکہ وہ افسانہ نگاری کو بنیادی طور پر نیم بیانیہ قرار دیتے ہیں اس لیے بیانیہ کے نئے نئے امکانات کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

منشایادؔ کی افسانہ نگاری میں تمام عناصر اور اجزا کو اُن کے مخصوص مقام کے مطابق برتا گیا ہے مگر تھیم، پلاٹ، اُسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، نقطہ نظر، ہیبت اور تکنیک وغیرہ میں ایک توازن کا احساس موجود ہے۔ غزل کی طرح ایمائیت اور ایجاز واختصار کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اسی ایجاز واختصار کی ایک کڑی اُن کے افسانچے بھی ہیں جن کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں کہ اُن کے اندر اتنی کہانیوں کا انبار باقی ہے کہ اُن تمام کا لکھا جانا ایک زندگی میں ممکن نہیں۔ اُن کے نئے مجموعے ''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' یہ افسانچے موجود ہیں جو اختصار کے ساتھ ساتھ منشایادؔ کی فکر اور ف کے کی دریچوں کو وا کرتے ہیں جو بہت کم لفظوں میں بہت کچھ کہے دینے کے ہنر کی گواہی دیتے ہیں۔

منشایادؔ افسانہ نگاری کے فنی اور فکری پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں آغاز سے اختتام تک ایک تسلسل کا احساس پیش کرتے ہیں۔ افسانے کا آخری جملہ اُن کے مطابق ایسا ہونا چاہے جو کسی بات کا انکشاف کرے اور تکمیل کا احساس پیدا کرے۔ منٹو جیسا بہترین افسانہ نگار بھی اپنے افسانوں کے آخری جملوں کی بدولت لازوال ہو گیا۔ اسی

طرح منشا یادؔ کے افسانے بھی اسی انداز کے جملے پیش کرتے ہیں جیسے ایک چھنا کا ہو اور چاروں طرف روشنی پھیل جائے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کہتے ہیں:

> ''محمد منشا یادؔ بنیادی طور پر Three Dimensional Perception کا افسانہ نگار ہے۔ اس کے ہاں ساری جہتوں اور سمتوں کا اعتبار قائم ہے۔ کسی ماہر بت تراش کے طرح خارج سے باطن کی دریافت کرتا ہے۔ یوں اس کے افسانے یک طرفہ اور یک رخ حقیقتوں کے احوال نہیں بلکہ تجرید کے لمس اور علامتوں کی تدبیر کاری کے باوجود زندگی کی بھرپور شہ مُتیسے لباب دو طرفہ حسی شراکت کے عکس نما ہیں۔ جن میں وہ تیسرا رخ بھی شامل ہو جاتا ہے جس کی روشنی میں سوئی اور زندگی سے عاری اشیا کے مہکتے سانس کو اُس نے افسانے کی دنیا میں نئے سیاق و سباق کے ساتھ بحال کیا ہے۔ بحال ہی نہیں کیا ان گونگے بہرے لوگوں کو زبان بھی دی ہے۔ یہ امر اس کے لیے ارتکاز مانگتا ہے کہ ہمارے عہد میں اور اک کا میدان چیخ رہا ہے زماں و مکان میں دراڑیں اُبھر رہی ہیں۔ سائیکی اور سوسائٹی دو اجنبی اور لاتعلق صورتیں ہیں سمتیں اور جہتیں اضافیت کے گھیرے میں ہیں اور حرکتیں ۔۔۔۔ خواہشیں سراب ہیں۔ اور منزلیں نایاب ۔۔۔۔ ہمارے بہت سے افسانہ نگار اس بڑھتے ہوئے ویسٹ لینڈ میں گرفتار ہیں۔ اس بنتے بگڑتے تناظر میں محمد منشا یادؔ نے ایک تسلسل کا ایقان فراہم کیا۔ ہمارے ماحولیاتی عمل کو حرکت کی نوید دی ہے۔ ماوراء واقعیت فلیش بیک کا یا کلپ صور تحال اور شعور کی رو ایسے پیٹرنز میں لکھنے کے باوصف۔ اس کے افسانوں میں ہمارے لمحوں کے رابطے موجود زندگی کا حوصلہ سلامت اور وژن کا قیام ہے۔''(۲)

منشا یادؔ نے دیہی ماحول کو بہت قریب سے دیکھا۔ اُن کے شعور نے اس فضا میں آنکھ کھولی۔ دیہی زندگی کے فیوض و برکات اور اُن کی قباحتوں نے اُن کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ گاؤں میں طبقاتی کشمکش اور تفاوت اُن کی سوچ کو خاص جلا بخش گئی۔ ان تمام مسائل نے ایک مہمیز کا کام کیا اور اُن کے اندر کے افسانہ نگار کو مجبور کیا کہ وہ کمزور بے بس، پسے ہوئے لوگوں کو موضوع بحث بنائیں۔ انہیں وہ حیات نو اور پائندگی عطا کریں جو اس سے پہلے انہیں نہیں ملتی تھی۔ مہرو سانسی، ناتو سانسی، کوڈو فقیر، دتا کمہار، علیا جیسے لوگوں کو تاریخ کبھی یاد نہیں رکھتی۔ یہ انسان نہیں کیڑے مکوڑے سمجھے جاتے ہیں مگر منشا یاد کی افسانہ نگاری نے اُن معمولی انسانوں کو ابدیت عطا کر دی۔

منشایادؔ فطرت سے محبت کرتے ہیں۔ وہ حساس انسان ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ کس طرح انسان اپنے مرکز سے دور ہو رہا ہے۔ مشینوں کی حکومت گلوبل ویلج کے عالمگیر تصور اور اندھی سائنسی ترقی نے بنی نوع انسان کی زندگی، رویوں، فکر و منظر اور تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہیں اس کا اندازہ منشایادؔ کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

> ''سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ انسان روز بروز مشین میں ڈھلتا جا رہا ہے اور نت نئے تباہ کن ہتھیار ایجاد کر رہا ہے۔ کمپیوٹر کی ترقی نے اس ادبی اور شعری ذوق سے اور بھی دور اور بیگانہ کر دیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کے سچے ذائقوں کے لیے مار دھاڑ کی وڈیو گیمز کی بجائے نسلِ نو میں شعر و ادب کا ذوق بحال کیا جائے اور اُنہیں ہلے گلے (Thrills) کی مصنوعی اور ہنگامی وقت گزاری کی بجائے سچی خوشی اور لطف انبساط سے تعارف کرایا جائے جو کلاسیکی موسیقی اور شعر و ادب کی دنیا کے علاوہ کہیں نہی پائی جاتی۔''(۳)

انسان نے ستاروں پر کمند ڈالنے کے شوق اور طاقت کے حصول کے جنون میں دنیا کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنا ایکو سسٹم تک تباہ کر دیا ہے۔ اس احساس کی عکاسی اُن کے ایک افسانے ''ایک تھی فاختہ'' میں ہوئی جہاں سارا شہر چھان لینے کے باوجود انہیں فاختہ نہیں ملتی۔ کتنی خاموشی اور کتنی گونگی بے حسی کے ساتھ انسان نے اپنے قدرتی اور فطری نظام کو تباہ کر دیا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ماڈرن ازم کے نشے میں دُھت آج کے جدید انسان کو اپنے اس جرم کی صدائے بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی۔ مذکورہ افسانے کے یہ آخری جملے بہت سے اسرار عیاں کرتے ہیں:

> ''پریشانی کی کوئی بات نہیں فاختائیں ختم نہیں ہو گئیں اور نہی ملک چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض شہروں کے باغوں میں کوے بہت ہو گئے ہیں اور جہاں کوے زیادہ ہو جائیں وہاں سے فاختائیں ہجرت کر جاتی ہیں۔''(۴)

ایک اور پیرا گراف مصنف کے اسی نقطہ نظر کو واضح کرتا ہے:

''مجھے یاد آرہا ہے کہ جب کچھ عرصہ پہلے شہر کے اسلحہ ڈپو میں دھماکے ہوئے تھے سنا تھا بہت سی فاختائیں مر گئی تھیں۔ کیا پتہ ساری مر گئی ہوں یا جو بچ گئی ہوں مزید دھماکوں کے ڈر سے شہر چھوڑ کر دور جنگلوں پہاڑوں کی طرف نکل گئی ہوں۔''(۵)

بظاہر اس میں اوجڑی کیمپ کے سانحے کی طرف اشارہ ہے۔ مگر حقیقت میں سائنسی ترقی کے وہ اثرات جو ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نت نئے اسلحہ گولہ بارود کی وجہ سے اس دنیا پر پڑ رہے ہیں، اس کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔

انسان کو جب اقتدار ملتا ہے یا وہ طاقت ور ہو جائے تو اس اختیار اور قوت کا اندھا دھند اور آزادانہ استعمال کرتا ہے۔ اس کی ایک جھلک اُن کے ایک افسانے ''بیل کہانی'' میں ملتی ہے جو سرکاری سانڈ کے متعلق ہے۔ اس کی بدمستیاں کا شہوت پرستی اور ظلم در حقیقت ہمارے ارباب اختیار پر ایک گہرا طنز ہے جو عوام کو زمین کے حقیر کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں اور خلق خدا پر مظالم ڈھاتے، اپنے انجام سے بے خبر رہتے ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے لے کر آج تک ان حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی کے سبب پورا ملک تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے۔ رہزن رہبر بن کر لوٹ کھسوٹ رہے ہیں اور اپنے انجام سے بے خبر اپنی مستی میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اس کی کئی تصویریں ''بیل کہانی'' میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ مثلاً :

''ہاں مجھے لگتا ہے کہ خدا نے آدمیوں کی طرح جانوروں میں بھی آقا اور غلام مالک اور مزدور کی تخصیص برقرار رکھی۔ میں جب کبھی اسے پیٹ بھر جانے کے بعد کسی گلی کے موڑ یا چورا ہے پر کھڑے جگالی کی چیونگم چباتے دیکھتا تو مجھے لگتا وہاں سے گزرنے والے گڈوں میں جُتے، بوجھ تلے پسنے اور ڈنڈے کھاتے اس کے ہم نسل اسے حسرت سے دیکھتے اور اپنے پیدا کرنے والے سے فریاد کرتے ہوں گے کہ اے پاک پرودگار یہ تمھارا انصاف ہے کہ کام کرنے اور بوجھ کھینچنے والے تو ڈنڈے کھائیں اور وہ مشٹنڈا جو کام کرتا ہے نہ بوجھ کھینچتا ہے اُسے کھانے، چرنے اور ہر جگہ گھومنے کی پوری آزادی ہے۔''(۶)

منشایاد کا سیاسی اور سماجی شعور اُن کے افسانوں میں ایسی کئی تصاویر پیش کرتا ہے۔ ہر وہ محنت کش جس کو اپنے خون سے بھی ٹیکس دینا پڑتا ہے جسے، اپنے سانس کی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ اللہ سے یہی سوال کرتا ہے کہ اس

کے حکمرانوں کے غیر ملکی دورے، حج عمرے اُس کے ٹیکس اور کمائی پر پلنے والے سانڈ کیا اللہ سے لمبی چھٹی لے کر اس کام پر مامور ہیں؟ اسی فلسفے کو اسی افسانے میں ایک اور جگہ یوں بیان کیا گیا:

> ''ہاں۔ چاچا اندھی طاقت کی ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں چاہے جتنے اختیارات حاصل ہو جائیں، یہ مزید اختیارات اور فتوحات پر اکساتی ہے اور کسی بڑی کامیابی اور فتح پر بھی اکتفا نہیں کرتی۔ دو ایک آدمی مغلوب ہو جائیں تو مزید آدمیوں کو ٹٹکاری پر لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ سپہ سالار ایک دو ملک فتح کرے تو سکندر اعظم کی طرح پوری دنیا پر قبضہ کرنے کو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔''(۷)

یہ منشایادؔ کے عصری شعور کا ہی ایک پہلو ہے کہ جو انہیں مذہبی منافقت، انتہا پسندی، ریاکاری اور مولویانہ فطرت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آج کی دنیا چشم زدن میں ترقی کی ایک سیڑھی سے دوسری پر جا پہنچتی ہے اور مذہبی انتہا پسند آج بھی وہیں کا وہیں ہے۔ یہ احتجاج ایک طرف تو منشایادؔ کی انسان دوستی اور عالمگیر اخوت کا اظہار ہے تو دوسری طرف قدامت پسندی، رجعت پسندی اور اڑیل پن کے خلاف بغاوت ہے۔ اُن کا افسانہ ''بچھو حکایت'' بہت ہی خوبصورت انداز میں ان تمام مسائل کا پیش کرتا ہے جو آج کے دور میں فتنہ و فساد کا باعث ہیں۔

''بچھو حکایت'' کئی اہم حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ جیسے مشرق اور مغرب کے بیچ صرف ارضی فاصلہ ہی نہیں بلکہ علم کی بھی ایک طویل خلیج حائل ہے مغرب علم اور سائنسی میدان میں بہت آگے ہے اور محض اپنی مشرقیت پر نازاں ہونا سوائے جہالت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس افسانے میں موجود باریش پاکستانی بزرگ کا کردار اس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس میں پاکستانی معاشرہ مبتلا ہے۔ اس کردار کی ذہنی اور نفسیاتی تہوں کا بڑا میق مشاہدہ پیش کیا گیا ہے۔ خاتون اور بزرگ کے مکالمے آج کے دور میں اُٹھنے والے کئی سوالات کے جوابات پیش کرتے ہیں۔ معاشرے میں موجود بچھوؤں کی فطرت کی بھرپور عکاسی ہے۔ مثلاً:

> ''دیہات میں اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر بچوں، عورتوں اور نادار لوگوں کو ہی کیوں ڈستے ہیں۔ جونہی کوئی شخص اندھیرے میں لکڑیاں اٹھانے، مزدور کدال سے مٹی کھودنے یا کوئی شخص چارپائی سے اتر کر جوتا پہننے لگتا ہے۔ اسے تاک میں بیٹھا بچھو کاٹ لیتا

ہے۔ اُپلے تھاپنے والی عورتیں، کوڑا اٹھانے والی بھنگنیں اور آنکھ مچولی کھیلتے لڑکے لڑکیاں اکثر اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔"(۸)

یہاں بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا بچھو کی فطرت ہے کہ وہ صرف کمزور کو ہی ڈسے گا؟ جو شخص مٹی، گوبر یا گندگی وغیرہ سے دور رہے یا اندھیروں سے محفوظ رہے اُسے نہیں ڈسے گا۔

مذکورہ افسانے میں علم کی کمی اور جہالت جیسے مسائل کی بڑی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ منشا یاد کی سیاست اور ملکی نظام پر گہری نظر ہے۔ چوریوں، ڈاکوں، دھماکوں اور خودکش حملوں نے آج کے انسان کو مضمل کر دیا ہے اور اسی دگرگوں کیفیت میں زندگی کہیں دور منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ منشا یاد کو ان تمام مسائل کا گہرا ادراک ہے۔ جس کا اظہار اُن کے بیشتر افسانوں میں ہوتا ہے جیسے "سائیکلو سٹائل وصیت نامہ" اس افسانے میں مذہبی جنونیت اور لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے کہ کس طرح ان طالع آزماؤں نے عوام کو اپنے اعراض کی سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ کس طرح یہ معصوم ذہنوں کو مذہبی افیون سے مدہوش کر کے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کا آلہ کار بناتے ہیں۔ مولانا سراج الدین کا کردار آج کے ان تمام مذہبی انتہا پسندوں کی نمائندگی کرتا ہے جو مذہب پر عمل کرنے کا مطلب قدامت پرستی سمجھتے ہیں۔ خواہ مخواہ مذہبی عقیدت کے نام پر خود کو اسی شریعت کا پابند کر لیتے ہیں جو نافذ ہی نہیں کی گئی، خود غرض ملاؤں کے لیے مذہب گویا موم کی ناک ہے جدھر چاہا موڑ لیا۔ ذاتی مقاصد کی برآوری کے لیے ملا منا پلی کورے کاغذ کی مانند ذہنوں کو داغدار کر کے خودکش حملے کرواتے ہیں اور لاشوں کو کیش کرتے ہیں۔ "سائیکلو سٹائل وصیت نامہ" انہی تصورات کے بیان کی ایک کڑی ہے۔ ایک طرف تو منشا یاد مذہبی ریاکاری کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو دوسری طرف سیاست کی سیاہ کاریاں بھی اُن کا اہم موضوع بحث ہے۔ اُن کا ایک افسانہ "فاختہ تو پاگل تھی" ہمارے سیاسی نظام پر کڑی تنقید ہے۔ علامتی رنگ میں لکھا گیا یہ افسانہ ڈکٹیٹروں کے استحصال اور عوام کی بے بسی کی عمدہ تصویر ہے۔ یہ افسانہ معاشرے کے اُن رِستے ناسور کی نشاندہی ہے جس نے ہمارے پورے نظام کو قریب المرگ کر دیا ہے۔ فصلی بٹیرے وقت کے حکمرانوں کی بیساکھیاں بن کر کمزوروں کو روندتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ، بیوروکریسی ان ظالموں کو آکسیجن فراہم کرتی ہے، ان تمام نکات کو بڑی عمدگی سے علامت کے رنگ کی آمیزش سے اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عدالتی نظام کی بے بسی کی بھی تفصیل بیان کی گئی ہے جہاں انصاف محض دیوانے کا خواب ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"گدھ راج میں برکت۔ سبحان تیری قدرت"

''ہواؤں، فضاؤں میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ چڑیوں، چھونے، جگنو، تیتر، کبوتر، فاختائیں اور دیگر کمزور پرندے پریشان ہو گئے۔ مگر کوؤں، ڈھوڈروں، توتوں، لالیوں، الوؤں، چیلوں اور شکار کرنے والے دوسرے پرندوں نے لڈیاں ڈالیں اور جشن منائے۔''(۹)

منشایادؔ ایک مصور، نقاد اور نبض شناس ادیب کی طرح اپنے مقصد بیان سے پوری طرف آگاہ ہیں۔ انہوں نے اوائل عمری سے لے کر آج تک زمانے نے جتنی کروٹیں بدلی وہ ان کو بڑی بلیغ نظری سے دیکھتے ہیں۔ جس نے گاؤں سے سکول تک کا سفر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پتھریلے راستے پر ننگے پاؤں کیا ہو وہ معاشرے کی اونچ نیچ کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے؟ اساڑھ کی گرمیوں میں انگارہ ہو چکے کنکر پتھر بچپن ہی میں انہیں اتنا حساس اور بالغ نظر کر گئے کہ تمام عمر ایک ماہر کوہ کن کی طرح وقت کے سمندر سے نئے نئے موضوعات اخذ کر کے لفظوں کا پہناوا پہنا کر افسانے تخلیق کرتے گئے۔ لہو کی وہ ننھی ننھی بوندیں جو اُن کے تلوؤں پر نمودار ہو کر کنکر پتھروں کو رنگین کر گئی تھیں، جب قلم کی نوک سے نکلیں تو افسانے کے حیرت کدے میں کئی رنگ بھر گئیں۔

وقت کا استعارہ اُن کے کئی افسانوں کی زینت بنا۔ انسان بیک وقت دو دنیاؤں میں سفر کرتا ہے۔ ایک طرف تو اُس کے اندر کا بت خانہ ہے جو اُن تمام تبدیلیوں سے مبرّا ہے جو وقت کی زد میں آ کر وقوع پذیر ہوتی ہیں جو انسانوں اور چیزوں کو داغدار کر دیتی ہیں، جس کے بے رحم ہاتھوں سے حسن اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے، دوسری طرف تغیر کا ثبات ہے، وقت کا اشہب ہے جو بغیر کسی مہمیز کے دوڑا چلا جاتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو منشایادؔ نے اپنے بیشتر افسانوں میں سمویا ہے۔ مثلاً

''پنجرے والا گھر''، ''توتے کی آنکھ''، ''خواہشیں سراب ہیں''، ۱۹۷۸ کا آخری افسانہ ''پناہ'' اور ''جیکو بجھے'' وغیرہ۔

ان افسانوں میں کردار دو دنیاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ ایک حقیقت کی دنیا میں جہاں زماں کی عمل داری ہے اور دوسری باطن کی دنیا جو خواہشوں کے پھولوں سے لدی پھندی باہر کے سراب کو بھی منزل سمجھ لیتی ہے۔ یہ باطن کی دنیا ہی دراصل فریب نظر ہے جو باہر کی دنیا کو ایسے دیکھنا چاہتی ہے جیسی وہ نہیں بلکہ جیسی وہ ہونی چاہیے۔ اس میں ذرا برابر بھی شک نہیں کہ واقعی چیزوں کو بہت کم ویسے دیکھا جاتا ہے جیسی وہ ہوتی ہیں۔ زیادہ تر دیکھنے والا اپنے نقطہ نظر کے مطابق دیکھتا ہے۔ اس فریب کا ذکر منشایادؔ بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ یہ اسی ہنر مندی کا اثر ہے کہ

وہ ایک حقیقت نگار کے طور پر انسان کے باطن کی کہانیوں کو اُس کی حقیقی دنیا سے اس طرح نتھی کرتے ہیں کہ کہانی صحیح معنوں میں افسانہ بن جاتی ہے۔

منشایادؔ کے افسانے جابجا تاریخی حوالوں سے بھی مزین ہیں۔ مثلاً پاکستان کا دولخت ہونا، زلزلے کا آنا اور اس کی تباہ کاریاں، دہشت گرد حملے، بم دھماکے مارشل لا کا لگنا وغیرہ۔ ٹیکس چوری، مالی استحصال جیسے گھن ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ وہ تاریخی حقائق اور سماجی طنز کے ذریعے معاشرے کے تعفن زدہ جوہڑ میں چند کنکر ضرور پھینکتے ہیں۔ منافقت نے دھوکہ دہی کا وہ بازار گرم کر رکھا ہے جس میں ''جنگل کا قانون'' ارباب اختیار کو من مانیاں کرنے کا بھرپور موقعہ دیتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے اخلاقی قدریں محض ریت کی دیواریں ہیں جنھیں جب چاہا ڈھا دیا۔ منشایادؔ کے افسانے انہی سلگتے موضوعات کا نوحہ معلوم ہوتے ہیں۔ ''ٹھہرا ہوا پانی'' امام مسجد کی ذہنی پسماندگی کا بیان ہے تو ''پنجرے میں بسیرا'' محب وطن پاکستانیوں کی جو غیر ممالک میں بستے ہیں اور پاکستان کے حالات پر کفِ افسوس ملنے والوں کی روداد ہے۔

ہمارے معاشرے میں پولیس کو ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے مگر منشایادؔ کی انسان دوستی اور محبت انکے لیے بھی درد محسوس کرتی ہے جو مختلف چیک پوسٹوں پر ڈیوٹی کرتے ہیں اور بڑی آسانی سے دہشت گردوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ دوسری طرف معاشرے کی عدم برداشت اور پولیس کا ظلم دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا بھی بیان کیا گیا ہے۔ جیسے سانحہ سیالکوٹ ہے۔ منشایادؔ کے ذہن پر حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسماعیلؑ کی گردن پر چھری چلانے والا عمل بڑی گہری چھاپ رکھتا ہے۔ وہ اکثر اپنی نگارشات میں اس تلمیح کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''بوکا'' تماشا، دام شنیدن میں اس تاثر کو پیش کیا گیا ہے۔

مثلاً تماشا میں اسی احساس کو اس طرح پیش کیا گیا:

> ''پھر میں نے دیکھا تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو۔ میں نے تمھارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمھارے گلے پر چھری چلانے اور تمھیں دوبارہ زندہ کرنے کے لیے ڈالا کرتا ہوں۔ مگر رات کے اس اُداس پہر میں مجھے اپنا اور ڈالنے کا انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اُڑ گئی۔''(۱۰)

اس عمل کو ایک اور جگہ وہ اسی افسانے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''صاحبان۔۔۔۔۔۔ قدر دان۔۔۔۔۔۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا۔۔۔۔۔۔ نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ایک کھیل ہے۔۔۔۔۔۔ نظر کا دھوکہ۔۔۔۔۔۔ اس پاپی پیٹ کی خاطر۔''(۱۱)

''بوکا'' میں وہ یوں اس بات کو لکھتے ہیں۔

''میں اسے زمین پر لٹاتا، گردن پر چھری رکھتا اور چلانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔ میں آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا اور اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلا دیتا ہوں اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل جاتی ہے کہ اس کی جگہ تم ذریح ہوئے پڑے ہو۔۔۔۔۔۔ استغفار بیٹا ۔۔۔۔۔۔ اللہ تمھاری عمر دراز کرے۔''(۱۲)

''دام شنیدن'' میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

''کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ عام آدمی کسی ہم زبان اور ہم جنس کو قتل تو کر سکتا ہے۔ حلال نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے پیغمبروں کا دل اور حوصلہ درکار ہے۔ انہیں بھی آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑتی ہے۔''(۱۳)

منشایاد انسانی رشتوں کی تصویر کشی میں کمال رکھتے ہیں جیسے والدین اور اولاد کا رشتہ جو اپنے اندر بہت گہرائی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک آزمائش بھی ہے کیونکہ اولاد کی محبت والدین کو ایسے ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جو عام حالات میں کوئی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اُن کے افسانے ''کاشی'' اور ''آدم بو'' میں اسی قسم کا بیان ملتا ہے۔

منشایاد نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، پرورش پائی وہ اُن کے فکر و خیال کا ایک لازمی جزو ہے۔ گاؤں کی زندگی، کھیت کھلیان، لوک گیت، ماہیے ٹپے، پنجابی زبان کی کہاوتیں عوامی لب و لہجہ اُن کے افسانوں میں ایک مستقل حیثیت سے موجود ہے۔ وہ ایک بظاہر تائب شاعر ہیں مگر اپنی نثر کو شاعری سے مزین کرتے ہیں۔ شاعرانہ وسائل سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھاتے ہوئے تشبیہات و استعارات کا بڑا سنبھل کر استعمال کرتے ہیں۔

وہ ایک ایسے فنکار ہیں جو اپنے مشرقی ہونے پر نازاں ہیں۔ اپنی مٹی، روایات اقدار اور اپنے ارد گرد کی دنیا سے گہری الفت و موانست کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اُن کو توتوں لالیوں، فاختاؤں بطخوں سے محبت ہے۔ انہیں وہ کاگ اچھا لگتا ہے جس سے ہماری کئی دیہی روایتیں وابستہ ہے۔ ڈب کڑھبا، کالا، کالو، ڈبو سے انہیں اپنائیت ہے۔

اگرچہ وہ ایک عرصے سے اسلام آباد میں مقیم ہیں اُن کے اندر اپنے گاؤں کے کھیت کھلیان بستے ہیں۔ یہ اُن کی روح میں سانس لیتے ہیں۔ کوڈ فقیر کی بے سری آواز بھی اُن کو پسند ہے۔

''اچیاں محلاں والئے پادے خیر فقیراں نوں''

''تماشا'' میں باپ بیٹا شاہ حسین کی کافی گاتے ہیں:

''میں دی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے''

کہیں مولوی عبدالستار کا ستوارہ ''ساجھے کھیت کی ہیروئین گنگناتی ہے۔ مقامی الفاظ جیسے سخر، خچرا، پسار وغیرہ کا بھی استعمال ملتا ہے۔ کئی افسانوں کا آغاز حمد و ثنا سے ہوتا ہے جیسے ''ماس اور مٹی'' اوڑ کی ہوئی آوازیں، میں اندازِ تحریر بامحاورہ نثر میں نہیں ہے۔

منشایاد مکالماتی انداز کی پیش کش کے بھی ماہر ہیں۔ جیسے ''رہائی'' ''گیارہواں سیل'' ''سلاٹر ہاؤس'' ''بچے اور بارود''۔ ''بچے اور بارود'' میں مکالماتی انداز ایک انٹرویو کی شکل میں ہے۔ جس کی بہت ہی دلکش اور معنی خیز صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ صیغہ واحد متکلم اور صیغہ واحد غائب اُن کے اکثر افسانوں میں موجود ہے۔ منشایاد کے مطابق وہ کثرت سے واحد متکلم کا صیغہ اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ کہانی حقیقت اور افسانے کا امتزاج لگے۔ عام انداز سے لکھی گئی کہانیاں انہیں اوپری سی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ فلیش بیک کی تکنیک بھی استعمال کرتے ہیں۔ ''دیدہ یعقوب'' اور سزا بڑھادی، اسی تکنیک کے تحت لکھے گئے ہیں۔

منشایاد کی کہانیوں میں موضوعات اور جذبات کا تنوع ہے۔ اُن کی پہلی کہانی کنوں تھی۔ اُن کی والدہ کی وفات نے اُن کے اندر ایسا کرب بھر دیا کہ انہوں نے لفظوں میں ماتم پرو دیا جائے اور ایک کم عمر بیٹے کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی۔ سارنگی اور تیرھواں کھمبا، ناکام محبت کے جذبے کو پیش کرتا ہے۔ ''کچی پکی قبریں'' جہاں طبقاتی تقسیم کو پیش کرتا ہے۔ وہاں کوڈو فقیر کی عشق کی اس آگ کی نمائندگی کرتا ہے جو اس کو اس قدر جلاتی ہے کہ وہ

نوراں کی شادی پر انتقام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ''تیرھواں کھمبا'' بھی جہاں ناکام محبت کو پیش کرتا ہے وہاں تیرہ کا ہندسہ مختلف کہاوتوں اور طعنوں کی مدد سے اس جذبے کو اور شدت بخشتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں جلوت میں خلوت، فطرت سے دوری کا کرب، روٹین کی چکی میں پسنے سے چڑچڑاہٹ کا احساس بڑی واضح شکل میں ملتا ہے۔ اپنی روٹین، اپنی فطرت اور عادات کا اسیر انسان ان سب سے چاہ کر بھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس کی عکاسی ''اپنا گھر'' میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جبلتوں کی سطح پر جینے والے وہ انسان جو آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب جدید انسان نئی دنیاؤں کی تسخیر کر رہا ہے ایک سوالیہ نشان کے طرح موجود ہیں ان کی بھرپور عکاسی ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی گاؤں کا کمی اسی طرح چودھری کے پاؤں میں بیٹھا ہے جیسے ''باگھ بگھیلی رات'' میں اس کو بیان کیا گیا:

''ان کمی کمینوں کے پائوں تلے زمین ہی کتنی ہوتی ہے''

اس طرح جبلتوں کی سطح پر جینے والے لوگوں کو کچھ اس طرح پوٹریٹ کیا گیا ہے۔

''وہ حرام حلال کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ کچھوے، بلیاں، گیدڑ نیولے سب کچھ کھا جاتے تھے۔ مرے ہوئے مویشیوں کا ماس، کتوں اور گدھوں سے چھین کر ہڑپ کر جاتے تھے ماس کھانا انہیں بے حد مرغوب تھا۔ خواہ وہ مرے ہوئے مویشیوں کا ہو یا مارے ہوئے مویشیوں کا۔۔۔۔ ہم آپ مردار جانور یا مویشی کا ماس نہیں کھاتے۔ کھانے کے لیے اسے خود مار لیتے ہیں۔ ہم زندہ مویشیوں کی بوٹیاں نہیں اُتارتے زندہ انسانوں کی بوٹیاں اتار لیتے ہیں لیکن وہ الگ مسئلہ ہے۔''(۱۴)

کتنا خوبصورت امتزاج ہے جبلتوں کے مارے انسان کا اور اُن کا جو زندہ انسانوں کی بوٹیاں اُتارتے ہیں۔ مگر پھر بھی مہذب کہلاتے ہیں۔ ایک گہرا سماجی طنز ہے جو منشایادؔ نے پیش کیا ہے۔ انسان کی صدیوں کی بھوک نے اُسے کبھی چین نہیں لینے دیا چاہے وہ پیٹ کی بھوک ہو یا اقتدار کی، طاقت کی، جنس کی، منشایادؔ ان صدیوں کی بھوک کے تاثر کو بڑی شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ''پولی تھین'' جس میں بھوک کا مارا شخص پولی تھین بیگ تک کھا جاتا ہے اور اس طرح یہ بھوک اُسے موت کے منہ میں لے جاتی ہے۔ ''راستے بند ہیں'' میں بھی ایک بھوکا انسان صرف کھانے کی چیزوں کو حسرت بھری نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ نظروں سے ہی لذت کشید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مہر و سانسی جیسے لوگ جو کھا کھا کر تے بھی کر لیں ان کی بھوک نہیں مٹتی۔

''پانی میں گھرا ہوا پانی'' میں دتو کمہار پانی ہے اور زیناں آگ۔ دتو تو چاہ کر بھی باوا تلاش نہیں کر پاتا گراسی دوران میں اس کے آنگن میں ننھا سا شرینہ آگ آتا ہے جس کا بیج نہ جانے کیسے آجاتا ہے۔ شاید مجو کی بدولت۔ اس افسانے کا آخری جملہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں بھی آخری جملہ اس طرح چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ منشایاد منٹو سے بھی متاثر تھے جس کا واضح اظہار ان کے ''منٹو کے نام ایک خط'' میں ہوتا ہے۔ جنک کی سوگندھی کے طرح منشایاد بھی کبھی کبھی پسے ہوئے طبقے میں انانیت کی موجودگی کا عندیہ دیتے ہیں۔

''پانی میں گھرا ہوا پانی'' کا آخری جملہ ملاحظہ ہو:

> ''ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی ایسا آدمی ہے جو ان چیزوں سے محبت کر سکتا ہے جو اُس نے نہ بنائی ہوں۔''(۱۵)

منشایاد کی منظر نگاری اور بیانیہ اپنی جگہ اہم مقام رکھتے ہیں مثلاً ''بند مٹھی میں جگنو'' میں لکھتے ہیں:

> ''بیچ بیچ کے بادلوں اور اصلی دھوپ میں آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ سورج لمبی لمبی زبانیں نکال کر سرمئی بادلوں کے نحیف جسموں سے نمی چاٹ رہا تھا۔''(۱۶)

''باگھ بگھیلی رات'' میں اُن کا انداز کچھ ایسا ہے:

> ''گلیوں میں اُداسی کی دھول اُڑنے لگی، درخت سرگوشیاں کرتے، آہیں بھرتے اور گلیوں کے آر پار کی کچی پکی دیواریں ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر بین کرنا چاہتیں۔''(۱۷)

یہ اُداسی اور ماتم کا کس قدر خوبصورت بیانیہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسا موسم انسان کے اندر کی دنیا کا ہوتا ہے ویسے ہی اُسے باہر کی دنیا نظر آتی ہے۔ ایک اعلیٰ افسر کے سجے سجائے گھر کو ایک ادنیٰ گریڈ کے نوکر کی نظر سے منشایاد نے کچھ اس طرح پیش کیا:

> ''سجا سجایا ڈرائنگ روم اس کے دو کمروں کے کوارٹر سے زیادہ کشادہ اور نہایت خوبصورت تھا۔ کھڑکیوں کے بیش قیمت اور نفیس پردے خوشنما قالین اور عالیشان صوفے دیکھ کر اندر داخل ہوتے ہوئے اُسے جھجھک محسوس ہونے لگی۔''(۱۸)

اسی پس منظر میں وہ ایک کم تر ادنیٰ ملازم کی ذہنی کشمکش کا بیانیہ پیش کرتے، جو اُسے اپنے حقیر ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اسے سب نظریں جنگ آمیز لگتی ہیں۔ اسے یوں احساس ہوتا ہے جیسے وہ بال بھر کا ہو گیا ہو اور تمام افسر زمانے کے خدا نظر آتے ہیں جن کے حضور وہ بخشش حاصل کرنے کھڑا ہے۔

منشایادؔ جزئیات کو منظر نگاری کے دوران نظر انداز نہیں کرتے اور بڑے موثر انداز میں اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں مثلاً ''پناہ'' میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''شہر کی بڑی سڑک ہے دونوں جانب عظیم الشان عمارتیں کئی کئی منزلہ ہوٹل پلازے، ائیر کنڈیشنڈ ریستوران اور بیکریاں، سیلف سروس شاپنگ سینٹرز۔۔۔۔۔ سپر مارکیٹیں آرائش اور زیبائش کے ساماں سے لباب دکانیں بھی چمکیلی کاریں، ہنستے مسکراتے خوش جمال ،خوش حال اور فارغ البال لوگ۔۔۔۔۔''(۱۹)

منشایادؔ کے افسانوں میں علامتی رنگ، شاعرانہ ادا، سماجی طنز، عوامی الفاظ فلسفیانہ نقطہ نظر، وجودیت کا فلسفہ، جبلتوں کا بیان اس قدر خوبی سے ہوا ہے کہ اُن کے فن و فکر کے عناصر آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ منشایادؔ زندگی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اُن کا فلسفہ حیات کیا ہے؟ اُن کی شخصیت کس کس سے متاثر ہے ان تمام باتوں کا بیان اُن کے افسانوں میں موجود ہے۔ اُن کے افسانوں کو پڑھنے کا مطلب گویا منشایادؔ کی شخصیت کا مطالعہ ہے، جب وہ اپنے افسانے میں یوسف زلیخا اور مرزا صاحبان کے اشعار پیش کرتے ہیں تو یہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ پنجابی شعر و ادب اور ہماری روایتی شاعری سے کس حد تک متاثر ہیں۔ اُن کی علامتیں اُن کے باطن کی گہری سچائیوں کی ترجمان ہیں۔ عوامی الفاظ اُن کے اپنی تہذیب و ثقافت سے جڑنے کی علامت ہیں۔ مثلاً عوامی لب و لہجے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''شریفاں اکثر ان دونوں کا ذکر کرتی تھی اور کل شام وہ اسے ملنے بھی آتی تھیں مگر پتہ چلا کہ وہ دونوں پھپھے کٹنیاں ہیں۔'' ''جیٹھانی گروپ کی عورتیں چڑیلیں، ڈائنیں اور بچھل پیریاں تھیں خون چوستی کلیجے چباتی اور بڑے ول چھل جانتی تھیں'' دیورانی گروپ کی عورتیں لُچیاں لفنگیاں اور مشٹنڈیاں تھیں وہ آنکھ مٹکا کرتی، چن چڑھاتی اوت ادھل جاتی تھیں۔''(۲۰)

کبھی منشا یادؔ صاحب لکن میٹی کا ذکر کرتے، کبھی پینگ کے لمبے ہلارے کا، کبھی سکون کے تو نبے سے بے فکری حاصل کرنے کا حوالہ دیتے ہیں، کبھی تیرہ تالن عورتوں کا۔ اکثر وہ اپنے افسانوں میں مخصوص زبان کا استعمال کرتے ہیں جیسے بچھو کہانی کی طرح بچھو کے ڈنگ مارنے اور بہت سے کیڑے مکوڑوں کے کلبلانے کا ذکر ''کوک بھرے کھلونے'' میں کرتے ہیں۔ اسی افسانے میں پھر سے وہ تاثر پیش کیا گیا جو بند مٹھی میں جگنو میں کیا گیا تھا جیسے وہ مٹیلک چھچھوندر کا ذکر کرتے ہیں جس نے اپنے باریک دانتوں سے آہستہ آہستہ بدن کو کترنا شروع کر دیا۔ اسی طرح ''بند مٹھی میں جگنو'' میں لکھتے ہیں کہ سوچ کی سخت جان اور بد شکل چھچھوندر اس کے دماغ میں تھوتھنی ڈالے مسلسل چیختی رہتی ہیں۔ ''دام شنیدن'' کی طرح ''جنگل کا قانون'' میں بھی مخصوص الفاظ ہیں کہ آدمی کے منہ میں گوشت پھاڑنے والی کچلیاں ابھی مضبوط تھیں۔ وہ ''دام شنیدن'' میں انسان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے منہ میں بھی بھیڑیے کے دانت ہوتے ہیں۔ ''پنجرے والا گھر'' میں اسی انداز کا بیان ہے کہ دوہڑوں اور کافیوں کے بول لمبی چونچوں والے کٹھ پھوڑے بن کر رات رات بھر اس کے چندن بدن پر چونچیں مارتے رہتے ہیں۔

منشا یادؔ کے افسانوں میں وجودیت کے فلسفے کی بھی جھلک ملتی ہے۔ سارتر کی کہانی ''متلی'' کی طرح اُن افسانوں میں بھی کئی مقامات پر متلی کا ذکر ہوتا ہے۔ بُو کا احساس موجود ہے۔ یعنی ایسا احساس جس میں مبتلا ہو کر انسان کو ارد گرد سے گھن آنے لگتی ہے۔ وجودیت کے فلسفے کے مطابق انسان کے پاس چوائس نہیں۔ وہ تنہا ہے، اکیلا ہے، بے بس ہے۔ ''خواب سراب ہیں'' میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''میرے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی گئی ہے۔ یہاں تک کے میرے پیدا ہونے میں بھی میرا عند یہ نہیں معلوم کیا گیا۔ سارے فیصلے مجھ پر ہمیشہ ٹھونسے گئے ورنہ اگر میری مرضی کا دخل ہوتا تو میں خود فیصلہ کرتا کہ کس صدی، ملک اور شہر میں اور کن لوگوں کے درمیان پیدا ہونا چاہتا ہوں لیکن والدین کے انتخاب سے لے کر ہر رنگ، نسل، عقیدے اور نام تک کے انتخاب میں میرا اپنا کوئی چوائس نہیں تھا میرا قد، بت، ناک نقشہ، اور آواز جس کی وجہ سے بعد میں کئی طرح کی پیچیدگیاں اور مشکلیں پیدا ہوئیں مجھے وراثت میں ملے۔ اس میں میری مرضی اور پسند بالکل شامل نہیں تھی۔''(۲۱)

''بند مٹھی میں جگنو'' میں اپنے جسم سے مردہ مچھلیوں کی بُو کا ذکر ہوا۔ مری لکھیاں اور گھن کے احساس کو شدت سے پیش کیا گیا۔ موسیقی کو مردہ کوے، انڈوں سے مرغی کی بیٹ، روٹی سے برادے اور سالن سے مردہ گوشت کی

سرانڈ کا ذکر ہوا۔ اور بالآخر بات متلی پر ختم ہوئی۔ ''اپنا گھر میں وہی فائلیں اور وہی ایک جیسے قے کئے لفظوں کا ذکر ہوا۔ ''دام شنیدن'' میں بھی قے اور بُو کا احساس موجود ہے۔ شب چراغ میں بک سٹال سے سرانڈ اُٹھنے کا بیان ہوا کہ ''تقریر سنتے سنتے اس کا جی متلانے لگا اسے اُبکائیاں آنے لگیں۔،،'' وغیرہ۔

منشایادؔ کے افسانے جیسے ''درخت آدمی''، ''پنج کلیان''، ''شجر بے سایہ''، ''جیکو پچھے''، ''سارنگی''، ''وقت سمندر'' بلاشبہ بہترین افسانوں میں شمارے ہوتے ہیں۔

''لوہے کا آدمی'' آزاد تلازمہ خیال کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔ ''پناہ'' اور ''تیرھواں کھمبا'' بیانیہ کا عمدہ تاثر لیے ہے۔ ''سانپ اور خوشبو'' میں سوانحی حوالہ موجود ہے۔

الغرض منشایادؔ کا فن افسانہ نگاری گویا ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے، بھانت بھانت کی خوشبو کے پھولوں کو مجتمع کیا گیا ہے۔ ''سلاٹر ہاؤس'' میں بہت ہی گہرا طنز موجود ہے۔ ''لفظوں سے بچھڑا آدمی'' شک اور غلط فہمی کے بیج کی آبیاری اور ببول کی کاشت کو پیش کرتا ہے۔

سارنگی میں ناکام محبت، خیالات کا تسلسل شعور کی رو کا بیان ہے۔ ''مائی فٹ'' میں انسان کے نفسیاتی پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ایک گھٹیا مگر بڑے عہدے پر فائز آدمی کی تذلیل دیکھنے والوں کو کیسی طمانیت دیتی ہے۔ دستار کو بطور علامت بڑی مہارت سے استعمال کیا گیا؛ ''راتب'' میں آدم کی گندم سے رغبت اور روٹی ڈالنے والے سے ایک رشتے کی استواری کا احساس موجود ہے۔؛ کاشی، ڈھلتی عمر کے والدین کا سچ بیان کرتا ہے۔ بہت سے واضح اور غیر واضح کرداروں اور کہانی کے اجزاء کو اس طرح ملا کر پیش کیا گیا ہے کہ منشایاد کی افسانہ نگاری بلاشبہ اپنی مثال آپ معلوم ہوتی ہے۔

منشایادؔ کے ذہن میں طرح طرح کے جو مضامین آتے ہیں وہ دل ہی دل میں انہیں لکھتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ خود کو کوڈو فقیر، علیانائی، صادو ترکھان، شیدو، مہترانی، اوور ٹائم کا ٹانگے میں جتا گھوڑا، تیرھواں کھمبا اور راستے بند ہیں کا 'وہ' سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو محسوس کر کے خود ہی پر طاری کر کے لکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے اندر اذیت کی چکی لگی ہوئی ہے جو دکھوں کا آٹا پیستی رہتی ہے انہیں خوشحال اور بے فکرے لوگوں کی زندگی متاثر نہیں کرتی بلکہ گرے پڑے، مفلوک الحال لوگ اچھے لگتے ہیں۔ یہ ان کے اندر کہانیوں کی تخلیق کا محرک بنتے ہیں؛ بعض اوقات تو وہ کوئی جانور پرندہ، ریل کا انجن، درخت یا کھمبا بن جاتے ہیں۔ بقول منشایاد کہ میں جگ بیتی کو ہڈ بیتی بنالیتا ہوں میں ہر کردار کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں افسانے کے روپ میں پیش ہونے کے باوجود حقیقت کی تمام جزئیات لیے ہوتے ہیں۔ان کے بقول کہ ''میں سچی کہانی نہیں لکھنا چاہتا میں جھوٹی کہانی بھی نہیں لکھتا۔ میں افسانہ لکھنا چاہتا ہوں''(''کہانی اور میں، پیش لفظ خلا اندر خلا)۔

منشایادؔ کے نزدیک افسانہ چاہے علامتی ہو تجریدی یا استعاراتی ہو، بنیادی چیز دلچسپی کا عنصر ہے۔ موضوع، مواد اور علامتوں کا تعلق اپنی معاشرت اور زمین سے ہونا چاہیے اور یہی تمام اصول ان کی افسانہ نگاری میں برتے گئے ہیں۔ان کا مقصدِ تخلیق افسانے کے قاری تک رسائی حاصل کر کے ادبی معیار اور وقار قائم کرنا ہے وعلامت کو خلیق میں گہری معنویت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔اسی لیے ان کی کہانی ایک معمہ نظر آتی ہے اور ان کا ہر کردار اپنے ماحول میں ڈھلا ہوا ہے۔ جہاں یہ مطابقت پیدا نہیں ہوتی وہاں المیہ کا جنم ہوتا ہے۔

منشایادؔ کی افسانہ نگاری کو دیگر ناقدین کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اور ان کی افسانہ نگاری ان کے نزدیک کیا اسرار ورموز رکھتی ہے، اس کا اندازہ ان چند آراء سے کیا جا سکتا ہے۔

منشایادؔ کی فن افسانہ نگاری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''منشایادؔ ایک ایسا ہی افسانہ نگار ہے جس نے اپنے ارد گرد حصار نہیں اُٹھا رکھے ہیں بلکہ اس کے سامنے تو امکانات کے افق حد نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کی دنیا میں اس کے بہت آگے بڑھ جانے، بہت دور نکل جانے کے امکانات موجود ہیں منشایاد کے اس بے حصار رویے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اردو افسانے کی روایت کو اپنے جلوس میں لے کر چلتا ہے اور روایت سے دوستی اس شعور کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ جدید دور کا ادیب ہے جو جدید دور کے بعض اپنے مخصوص تقاضے بھی ہیں، ادب کی ہر صنف کو اس ذہن کے نوجوان دستیاب ہوں تو پھر ادب کے مستقبل کا بول بالا سمجھیے۔''(۲۲)

ممتاز مفتی کہتے ہیں:

> ''شخصیت کے لحاظ سے منشایادؔ میں روانگی ہے بیک وقت اس کی شخصیت سرخ بھی ہے اور سبز بھی اس میں قیام بھی ہے اور حرکت بھی پانی بھی ہے اور مٹی بھی مادہ بھی ہے اور انرجی بھی اس کی شخصیت فن کارانہ بھی ہے اور غیر فن کارانہ بھی۔''(۲۳)

مزید لکھتے ہیں:

''میری دانست میں منشایادؔ واحد افسانہ نویس ہے جو ہمارے دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہی دلاتا ہے ہمیں اپنی روایت اور شناخت کی یاد دلاتا ہے۔ city oriented ہونے کی وجہ سے ہم اپنی روایت سے کٹ گئے ہیں، ہمارا کلچر کھچڑی کلچر بن کر رہ گیا ہے ہمارے دانشور west oriented ہونے کی وجہ سے مظفر علی سید بن گئے ہیں، منشایادؔ وہ واحد افسانہ نویس ہے جو ہمیں اصلی دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہ کرتا ہے اپنی لوک روایات کی یاد دلاتا ہے جو ہماری شناخت ہیں۔ ''

مظفر علی سید کے خیال میں:

''منٹو کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنی انا کو زیادہ سے زیادہ دبا رکھا ہے ان میں منشایادؔ کا شمار بھی لازم ہے۔ اس نے بہت سی چیزوں کو اپنی ذات میں جذب ہونے دیا ہے۔ اور ان سے زیادہ رنگا رنگ اشیا میں اور اشخاص میں خود کو جذب کیا ہے۔ اسے بقول خود ''لت پڑ گئی ہے'' اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھے بلکہ ان کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ بقول انتظار حسین اس کا جی چاہے تو بکرے کی کھال میں بھی چھپ جائے ۔۔۔۔۔ جیسا کہ اس نے ڈنگر بولی میں کیا ہے، یہ صلاحیت اُس قوتِ مشاہدہ سے مختلف ہے جس پر ہمارے مکتبی ناقدین افسانہ اصرار کیا کرتے تھے۔''(۲۴)

مشرق اور مغرب کے ناقدین کی نظر میں منشایادؔ کا مقام اُسکے غیر معمولی اور قدآور افسانہ نگار ہونے پر دال ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

''ماس اور مٹی کا خالق محمد منشایادؔ ایک پیدائشی افسانہ نگار ہے۔ کہانیاں اس کے گرد یوں پھرتی ہیں جیسے مدھ مکھیاں جنھیں شہد کی تلاش ہو یا گوپیاں جو ایک روشن نقطے کے گرد رقص کرنے کی آرزو میں پاگل ہو گئی ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اس تمثیل میں ''ماکھی'' یا روشنی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں بلکہ اصل کردار ہی ان کا ہے کیونکہ اگر اس تمثیل سے ماکھی یا روشنی کو منہا کر دیا جائے تو مدھ مکھیاں بیدار ہی کیوں ہوں؟ اور گوپیوں کی چھاگلوں میں جھنکار ہی کیسے پیدا ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ خود منشایادؔ کی شخصیت میں کچھ

ہے کہ اسے دیکھتے ہی کہانیاں بے قرار سی ہو کر اس کی طرف لپکتی ہے۔ اور وہ انہیں چھو کر کیا سے کیا کر دیتا ہے۔"(۲۵)

وارث علوی کے خیال میں:

"اور جب کتاب میں نے پڑھی تو مجھ پر نہایت ہی منفرد فنکار کے تخیلی اعجاز کا انکشاف ہوا۔ اس کے بعد تو جتنی کتابیں آتی رہیں منشایاد کی تخلیقی امیج اور فنکارانہ پختگی کا احساس دلاتی رہیں۔ میرا یہ احساس دن بدن قوی ہوتا چلا گیا، کہ بیدی اور منٹو کی نسل کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی ہے اس میں منشایاد ایک قد آور افسانہ نگار ہیں۔ اور ادب کی تاریخ میں ان کے لئے صفحات محفوظ ہیں۔ نوادرات تراشنے والا تخیلی اور نہایت ہی ثروت مند زبان، حساس ترین الفاظ سے تشکیل پایا ہوا اچھوتا اسلوب اور تخیلی ذہن پر یکے بعد دیگرے روشن ہوتے ہوئے تاروں کی طرح روشن ہوتی کہانیاں منشایاد کی عظمت کی نشانیاں ہیں۔"(۲۶)

امرتا پریتم نے منشایاد کی کہانیوں میں لفظوں میں پوشیدہ احساسات کو روشنی فراہم کرنے کا ایک منبع قرار دیا ہے۔ وہ اُن کی کہانیوں کو طلوع ہوتے سورج کی لالی کے وقت پڑھی جانے والی کہانیاں قرار دیتی ہیں اُن کے مطابق منشایاد کی کہانیاں ایک سان ہیں جن کے لفظ لفظ پر چڑھ کر انسان کی نظر تیز ہوتی ہے۔

محمد علی صدیقی کے نزدیک منشایاد کی مقبولیت کی بڑی وجہ ایک بہت پیچیدہ مسئلہ کے بیان کے لیے اپنی کہانی کو بہت سادہ ابتدا کے ساتھ اور کہانی کے انجام تک کے مرحلے کو جدید لہجہ کی کاٹ کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

انتظار حسین کی رائے میں تجریدی افسانے سے کہانی جب غائب ہوئی تو اس کی تلاش کا عمل شروع ہوا۔ جب منشایاد کے افسانوں پر نظر پڑی پتہ چلا کہ کہانی در حقیقت منشایاد کے افسانوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ گویا منشایاد کے افسانوں نے افسانے میں کہانی کے عنصر کو پھر سے زندہ کیا۔ ورنہ علامتی اور تجریدی افسانے میں یہ منفقود تھی۔ شمس الرحمن فاروقی منشایاد کے بارے میں ہوں رقمطراز ہیں:

"منشایاد کی افسانہ نگاری کا یہ وصف ایسا ہے جس میں کوئی اُس کے برابر نہیں۔ وہ ہماری دنیا کے ہر پہلو ہماری زندگی کے ہر حادثے، ہمارے تخیل کے ہر تاریک یا روشن کونے کو اپنی گرفت میں باآسانی لے آتا ہے۔ موضوع کے اس غیر معمولی تنوع کے آگے اسلوب کے

تنوع کا احساس ماند پڑ جاتا ہے۔ آج کے افسانہ نگار جس بے چارگی سے معاصر زندگی کے نمایاں اور اخبار کی سرخیوں جیسے چیختے ہوئے مظاہر کو اخبار یا ٹی وی سے اٹھا کر من و عن بیان کر دیتے ہیں ان کی بے چارگی کچھ کم ہو سکتی تھی اگر وہ منشایادؔ کے افسانے پڑھتے اور اُن سے کچھ سبق سیکھنے کی سعی کرتے۔ "(۲۷)

منشایادؔ کے افسانے اُن کے محسوسات کے ایک خزانے کا نام ہیں۔ یکسانیت کا عنصر اُن کے افسانوں میں بہت کم ہے اور حیرت انگیز حد تک تنوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جزئیات کا استعمال کرتے ہیں۔ ابہام بھی پیدا کرتے ہیں۔ حواس خمسہ کو متحرک رکھتے ہیں۔

فرمان فتح پوری منشایادؔ کے افسانوں میں آدمیت سے پیار، انسان کی معصومیت بھولپن سچائی اور ملائمت کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق منشایادؔ کی کہانیوں کے تیز دھارے خواہ ان کا تعلق ماحول و پس منظر سے ہو یا کردار و مکالمات سے، عموماً دیہاتی زندگی کے پہلو سے پھوٹتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی روایت کے افسانہ نگار ہیں مگر اپنی منزل تک رسائی کے لیے پگڈنڈی اُنہوں نے خود بنائی ہے۔

وہ دیہات کی کھردری لیکن معصوم زندگی کا شہر کی مہذب مگر منافق زندگی سے ایسا موازنہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کا اصل روپ سامنے آجاتا ہے۔ منشایادؔ کے افسانوں کے موضوعات غربت، افلاس، معاشرتی ناہمواری احساس تنہائی، ذہنی انتشار سوچ کا الجھاؤ، روح کی بے چینی اور جسم کی بھوک وغیرہ ہیں۔

سید ضمیر جعفری نے منشایادؔ کی مقبولیت کا باعث اُن کی حقیقت پسندی، بے باکی اور اسلوب کی دلربائی کو قرار دیا ہے وہ انہیں روح کا مبصر قرار دیتے ہیں۔ اختصار، شیریں بیانی اور افسانے میں آپ بیتی کا انداز اپناتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم کے مطابق "منشایادؔ اپنے اندر پھیلے ہوئے غم کو زاویے بدل بدل کر قسطوں میں لکھ رہا ہے۔

عطاالحق قاسمی نے منشایاد کو تصویر کشی کا ماہر قرار دیا ہے۔ وہ انہیں ماہر نفسیات قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے افسانوں میں انسانی فطرت کی باریکیاں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ کا کرب انگیز بیان بھی موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"افسانہ منشی پریم چند سے چلتا ہوا، انتظار حسین تک اور انتظار حسین سے منشایادؔ تک پہنچا ہے اور اس کے سارے پیش رو اس پر فخر کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اب

عہد جدید تر میں منشایاد سے بڑا افسانہ نگار کوئی نہیں۔ آج کا اُردو افسانہ اگر شہر ہے تو منشایاد اس شہر کا دروازہ ہے۔"(۲۸)

امجد اسلام امجد کے مطابق محمد منشایادؔ جدید اردو افسانے کا سب سے معتبر حوالہ ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں:

"منشایادؔ اور اس کے بہت سے ہم عصر علامت نگاروں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ علامت کو Obsession نہیں بناتا اور اُسے اس قدر استعمال کرتا ہے جتنی ضرورت ہو، اس کی کہانیوں میں موضوع اور ہئیت کا یہی خوبصورت توازن ہے جس نے اس کے اسلوب کو انفرادیت عطا کی ہے۔ "بند مٹھی میں جگنو" سے "درخت آدمی" تک اس کی بہت سی کہانیوں کا اسلوب جدید اور جدید تر ہونے کے باوجود اپنی زمین، ماحول، عوام، حقیقت نگاری سے اس طرح روشن اور معطر ہے کہ علامت نگاری کہیں بھی آپ کا راستہ نہیں روکتی، کہیں آپ کو گمراہ نہیں کرتی اور کہیں آپ سے پہاڑے نہیں سنتی۔"(۲۹)

ڈاکٹر انور سدید بھی منشایادؔ کو حقیقت نگار قرار دیتے ہیں۔ اور اُن کے کرداروں کو جانے پہچانے کردار سمجھتے ہیں۔ اعجاز راہی انہیں عصر حاضر کا ایسا کہانی کار بیان کرتے ہیں جو جوان، تازہ اور نئے موضوعات کو عالمانہ شعور اور تخلیق سے آراستہ کر کے پیش کر رہا ہے۔

جمیل یوسف منشایادؔ کو پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ خالدہ حسین کے مطابق وہ عورت کے بنیادی مرکز اور شدید وابستگی کا ادراک رکھتے ہیں۔ رشید امجد جو بذات خود ایک بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اور منشایادؔ کے ہمعصروں میں شمار ہوتے ہیں وہ یوں رقمطراز ہیں:

"منشایادؔ ایک صاحب فن افسانہ نگار ہے۔ اس کی کہانیوں کا سماجی سیاسی دائرہ بہت وسیع ہے کہ اس نے کھلی آنکھ سے زمانوں کو گزرتے اور واقعات کو بیتتے دیکھا ہے۔ دیہات سے شہر اور شہر سے نئے شہر تک اس کے کردار پڑھنے والے کے اندر اتر جاتے ہیں کہ منشایادؔ انہیں اپنے فن کے چاک پر اس مہارت سے ترتیب دیتا ہے اور تخلیق کرتا ہے کہ وہ ایک جیتا جاگتا کردار نہیں رہتے ایک علامت بھی بن جاتے ہیں۔ اس کے پاس گتھی ہوئی کہانی جسے اس نے اپنے زندہ اور رواں اسلوب سے ایسی صورت عطا کی ہے کہ جدید افسانے میں اس کا نام اہم ہی نہیں منفرد بھی ہے، ایک طویل فنی ریاضت مشاہدے اور مطالعے نے اس کی کہانیوں کو

اگر ایک طرف اپنے عصر سے جوڑا ہے تو دوسری جانب ان میں ماورائے عصر خوشبو بھی ہے۔ جدید افسانے کی کوئی بھی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل ہو گی۔"(۳۰)

جمیل آزر منشایاد کو منٹو کے بعد اردو افسانے کا سب سے بڑ قد آور افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ نجم الحسن رضوی منشایاد کو ان کے افسانے "درخت آدمی" کے مماثل ایک ایسا ہی درخت قرار دیتے ہیں جس کی جڑیں اپنی دھرتی میں گڑی ہوئی ہیں۔ اور اس کی کہانیوں کی ہری بھری ڈالیوں پر عصری صداقتوں کے پرندے چہچہاتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی اُن کی کہانیوں کو ہمارے عہد کی سیاہ کاریوں کی روداد قرار دیتے ہیں۔ وہ انہیں گرے پڑے، محروم اور استحصال زدہ لوگوں کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔ منشایاد کی افسانہ نگاری پر ناقدین کی اتنی آرا ہیں کہ اگر لکھنے پر آئیں تو دفتروں کے دفتر بھر جائیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ منشایاد جدید افسانہ نگاری میں سب سے منفرد اور نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ وہ حقیقت نگاری اور علامت کے استعمال میں ایک خوبصورت توازن رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانے، ان کی کہانیاں ہمارے دور میں سانس لیتی ہیں۔ وہ پاکستان کے افق پر ہونے والی تبدیلیوں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر اُن کی بلیغ نظر ہے۔ وہ پیدائشی فنکار ہیں۔ قدرت نے اُن کے باطن کو کہانیوں کی نعمت سے مالا مال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانیاں اُن کو مضطرب رکھتی ہیں۔

اُن کے افسانوی مجموعے "اک کنکر ٹھہرے پانی میں" کے آخر پر موجود اُن کے افسانچے بھی جو "مٹھی بھر جگنو" کے عنوان سے ہیں گویا کلبلاتی کہانیاں ہیں جو قرطاس پر پھیلنا چاہتی ہیں۔ یہ منشایاد کی مختصر نویسی اور جزئیات نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ "تتلی کی موت" "مردے کھانے والا" "حجاب" نجات میں طنز نمایاں ہے۔ جبکہ باپتا، درزی کا وعدہ "وہاں ایک باغ تھا" آج کے عہد کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ "دھماکہ" میں انسانی نفسیات کے ادراک کی جھلک ملتی ہے "وقت کی پابندی" میں ہمارے معاشرے میں وقت کی ناقدری اور اُسے ضائع کرنے پر طنز کیا گیا ہے۔

منشایاد کے افسانچے بھی اُن کے افسانوں کی طرح متنوع موضوعات اور اسلوب کی کئی جہتیں لیے ہوتے ہیں۔ جو اندر کی تسکین کا اچھا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ منشایاد کا "بند مٹھیمیں جگنو" سے لے کر "اک کنکر ٹھہرے پانی میں" تک کا افسانوی سفر بلاشبہ یادگار ہے۔ جس میں انہوں نے افسانوی ادب کو بہت کچھ دیا۔

حوالہ جات

۱۔ اسلم سراج الدین محمد منشایاد شخصیت و فن مشمولہ منشایاد ایک یادگار انٹرویو۔ ڈاکٹر اسد فیض اکادمی ادبیات اسلام آباد ۲۰۱۰

۲۔ اقبال آفاقی ڈاکٹر، منشایاد کے منتخب افسانے، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۰۸

۳۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۴۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۵۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۶۔ منشایاد، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۷۔ منشایاد، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۸۔ منشایاد، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۹۔ منشایاد، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۱۰۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۱۱۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۱۲۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۱۳۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۱۰

۱۴۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۱۵۔ منشایاد، شہر فسانہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۱۶۔ منشایاد، شہر فسانہ، مشمولہ ''بند مٹھی میں جگنو'' دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۱۷۔ منشایاد، شہر فسانہ، مشمولہ ''باگھ بگھیلی رات'' دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۱۸۔ منشایاد، شہر فسانہ، مشمولہ ''اوور ٹائم'' دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۱۹۔ منشایاد، شہر فسانہ، مشمولہ ''پناہ'' دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۲۰۔ منشایاد، شہر فسانہ، مشمولہ ''پناہ'' دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۳

۲۱۔ منشایاد، شہر فسانہ، مشمولہ ''خواہش سراب ہیں'' دوست پبلی کیشنز اسلام آباد ۲۰۰۹

۲۲۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰

۲۳۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰
۲۴۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰
۲۵۔ وزیر آغا، داکٹر، دائرے اور لکیریں، مکتبہ جدید پریس لاہور ۱۹۸۶
۲۶۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰
۲۷۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰
۲۸۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰
۲۹۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰
۳۰۔ اسلم سراج دین، منشایاد، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد ۲۰۱۰